ماہنامہ

# اِنذار

مدیر

ابویحییٰ

اکتوبر 2017ء

کامیاب زندگی علم کے امتحان
میں کامیابی سے نہیں بلکہ
حلم کے امتحان میں
کامیابی سے ملتی ہے

www.inzaar.org

ماہنامہ

# اِنذار

اکتوبر 2017ء محرم/صفر 1439ھ

جلد 5 شمارہ 10

ابویحییٰ کے قلم سے



فی شمارہ ـــ 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

## اولاد اور خدا

کسی کے ہاں اولاد ہونا زندگی کا ایک بڑا خوبصورت تجربہ ہوتا ہے۔خاص کر ماں اور باپ اپنی گود میں کھلنے والی معصوم کلی کو دیکھ کر جس مسرت اور شادمانی کے احساس سے گزرتے ہیں، اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا۔ان کا دل محبت اور شفقت کے جس لمس سے روشناس ہوتا ہے، اس کا کوئی تجربہ انھیں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوتا۔

ایک عام انسان یہیں تک رک جاتا ہے۔مگر جب یہ تجربہ کسی خداپرست پر گزرتا ہے تو یہ اس کے لیے اپنے مالک کی اس غیر معمولی محبت کی دریافت بن جاتا ہے جو اسے اپنے بندوں سے ہے۔اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا خدا اپنے بندوں سے کیسی غیر معمولی محبت کرتا ہے۔اسے رسول خدا کے وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں کہ جب ماں اپنے دودھ پیتے بچے کو جہنم میں نہیں پھینک سکتی تو خدا کیسے پھینک سکتا ہے۔

ایک خداپرست یہیں تک رک جاتا ہے۔مگر یہ تجربہ جب کسی عارف پر گزرتا ہے تو اس کے سامنے اپنی زندگی کی وہ کتاب کھل جاتی ہے جس کے ہر ورق پر ایک طرف خدا کے کرم کی داستان رقم ہے اور دوسری طرف اس کی غفلت ،معصیت اور نام نہاد نیکیوں کی کہانی درج ہے۔ جس کے بعد اسے اپنے گناہ ایک پہاڑ ، اپنی غفلت ایک بوجھ، اپنے عیب ایک غلاظت اور اپنی نیکیاں معصیت محسوس ہونے لگتی ہیں۔

وہ سراپا فریاد بن جاتا ہے کہ مالک! جس طرح ماں باپ بچے کی نجاستوں کی بنا پر اسے نہیں چھوڑتے تو بھی اس بندے کو اس کے گناہوں کے باوجود مت چھوڑ۔ماں باپ بچے کو پاک کرتے ہیں، تو بھی مجھے پاک کردے۔یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب خدا بندے کے ہر گناہ کو نیکی کے خانے میں لکھ دیتا ہے اور اسے پاک کرکے جنت کی پاکیزہ بستی کے لیے منتخب کرلیتا ہے۔

# استاد کا مقام

کل رات خالد ادریس صاحب (سڈنی) کا فون آیا۔ وہ ہسپتال سے بات کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کچھ دیر قبل ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ اپنے والد کے متعلق انھوں نے بتایا کہ وہ کراچی پولی ٹیکنک میں پینتیس برس استاد رہے اور ہزارہا طالب علموں نے ان سے علم و ہنر سیکھ کر اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ ایک انتہائی مخلص استاد تھے اور کم ہی کلاس سے غیر حاضر ہوتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت بھی ان کی دو تین برس کی چھٹیاں موجود تھیں جو انھوں نے نہیں لی تھیں۔ ان کے اخلاص اور انکسار کی بنا پر تمام طلبا ان کی بہت عزت کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ استاد کسی معاشرے کے تن مردہ میں زندہ خلیے پیدا کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ استاد اگر اچھے، مخلص اور دیانت دار ہوں تو وہ تربیت کا سب سے موثر ادارہ تعمیر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اساتذہ کا یہ ادارہ ہمیشہ بہت فعال رہا تھا۔ ہماری نسل شاید وہ آخری نسل تھی جو زندگی میں اپنے مقام کا کریڈٹ اپنے استاد کو دیتی ہے۔ مگر دور جدید میں ہمارا عظیم ترین المیہ یہ ہے کہ یہ ادارہ اب کم و بیش تباہ ہو چکا ہے۔ اب استاد کے مقام پر کھڑے ہوئے بیشتر لوگ وہی حیثیت رکھتے ہیں جو دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ملازمین کی ہوتی ہے۔

ہمیں اگر اپنے معاشرے کو تباہ ہونے سے بچانا ہے تو ہمیں اساتذہ کے معیار، مقام اور مرتبہ ہر چیز کو بدلنا ہوگا۔ ہمیں اپنے بہترین لوگوں کو اس شعبے میں لانا ہوگا۔ ان کا معیار انتخاب، سفارش اور رشوت کے بجائے سخت ترین میرٹ کو بنانا ہوگا۔ ان کی عزت اور وقار کی بحالی کو اپنا اہم ترین مسئلہ بنانا ہوگا۔ ان کو بہترین ممکنہ سہولیات اور مراعات فراہم کرنا ہوں گی۔ سب سے بڑھ کر یہ جذبہ بحال کرنا ہوگا کہ استاد باپ ہوتا ہے جو ایک دو پایہ حیوان کو اعلیٰ انسان بناتا ہے۔ استاد کی اس حیثیت کو بحال کیے بغیر معاشرے میں کسی خیر و فلاح کا کوئی امکان نہیں۔

# دولت کی نفسیات، جنت کی نفسیات

یہود دنیا بھر میں دولت کمانے کا ایک استعارہ ہیں۔ان کے بخل اور دولت کمانے کو مقصد زندگی بنا لینے کے حوالے سے متعدد لطیفے اورواقعات گردش میں رہتے ہیں۔اسی پس منظر میں ہمارے ہاں کی بعض کمیونٹیز بہت مشہور ہیں اور عملاً مشاہدہ بھی یہی ہے کہ وہ پیسہ کمانے میں دوسرے طبقات سے بہت آگے رہتے ہیں۔

زیادہ پیسہ کمانے کا یہ عمل کوئی راکٹ سائنس نہیں۔ یہ ایک نفسیات ہے جو خاندان اور برادری کے زیر اثر پیدا ہو جاتی ہے۔اس میں انسان ہر چیز اور ہر موقع کو اسی پہلو سے دیکھتا ہے۔مثلاً عام لوگوں کے برعکس جو دس لاکھ جمع ہونے پر دس لاکھ کی گاڑی خریدتے ہیں، اس نفسیات کے لوگ دس لاکھ جمع ہونے پر خود موٹر سائیکل میں گھومتے اوراس رقم کو کسی کاروبار یا انویسٹمنٹ میں لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ گاڑی خریدنے والوں کے دس لاکھ دس سال بعد ایک لاکھ رہ جاتے ہیں اورانویسٹ یا کاروبار کرنے والوں کے دس لاکھ دس کروڑ بن جاتے ہیں۔انفرادی طور پر کسی شخص کے پاس دولت کا کم یا زیادہ ہونا قسمت پر منحصر ہوتا ہے، لیکن عمومی طور پر اسی رویے کی بنا پر یہ کمیونٹیز عام لوگوں سے زیادہ پیسے والی ہوتی ہیں۔

اس طرح کی کمیونٹیز کو ہم ''دولت کی نفسیات'' میں جینے والی کمیونٹیز کہہ سکتے ہیں۔ان کا لائف اسٹائل اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک کروڑ کی گاڑی خرید سکتے ہیں تو دس لاکھ کی خریدتے ہیں۔ دس کروڑ کے گھر میں رہ سکتے ہیں تو ایک کروڑ کے گھر میں رہتے ہیں۔ باقی تمام پیسہ کاروبار اور انویسٹمنٹ میں لگا رہتا ہے۔ یوں یہ لوگ زیادہ سے زیادہ دولت منداور باقی لوگ بس عام سطح پر زندگی گزار کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

جنت کی آنے والی دنیا کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہوگا۔ وہاں پر کچھ کمیونٹیز ہوں گی

جو اپنے مقام، مرتبے، دولت، اسٹیٹس میں باقی تمام اہل جنت کے لیے باعث رشک ہوں گی۔ ان کے گھر باقی سب لوگوں سے زیادہ بڑے اور خوبصورت ہوں گے۔ ان کی سواریاں باقی سب لوگوں سے زیادہ جدید اور شاندار ہوں گی۔ ان کے پاس جنت کے ہر اعلیٰ سے اعلیٰ کلب کی ممبر شپ ہوگی۔ جنت کے ہر پرفضا مقام پر ان کی رہائش گاہیں ہوں گی۔ جنت کے ہر ریسٹورنٹ کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں گے۔ اور سب سے بڑھ کر انبیا کی محفل اور خدا کی مجلس میں سب سے آگے ان کو جگہ ملے گی۔

یہ وہ لوگ ہوں گے جو موجودہ دنیا میں ''دولت کی نفسیات'' کے بجائے ''جنت کی نفسیات'' میں جیے تھے۔ انھوں نے دین کے سارے احکام کی مقدور بھر پیروی کی تھی۔ انھوں نے ایمان و اخلاق کی قرآنی دعوت اور نبوی ماڈل کو اپنی زندگی بنالیا تھا۔ یہ اپنے وقت، صلاحیت اور پیسے کو آخرت میں انویسٹ کرتے اور خدا سے کاروبار کرتے رہے۔

ایسا نہیں تھا یہ لوگ ترک دنیا کر کے جیے تھے۔ انھوں نے شادیاں کیں۔ اولادیں پیدا کیں۔ گھر بھی بنائے۔ سواریاں بھی رکھیں۔ مگر ان میں سے کسی چیز کو جنت کے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ کیونکہ ان کا مقصود و مطلوب جنت کے اعلیٰ درجات تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ خدا کے ساتھ جو کاروبار اور آخرت کی دنیا میں جو انویسٹمنٹ وہ کر رہے ہیں، اس کے ڈوبنے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اس کاروبار میں نقصان کا کوئی اندیشہ ہی نہیں اور نفع کم از کم دس گنا اور زیادہ سے زیادہ سات سو گنا بلکہ بہت سے معاملات میں بے حد و حساب ہے۔ چنانچہ انھوں نے دنیا کو ضرورت کی سطح پر رکھا اور باقی ہر اضافی پیسہ، وقت، توانائی اور جذبے کا رخ آخرت کی طرف موڑ دیا۔

اہل جنت کے یہی وہ لوگ ہوں گے جو باقی اہل جنت کے لیے باعث رشک ہوں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے بڑھ کر خدا سے قریب ہوں گے۔

# درخت لگانے کا بہترین موقع

ایک چینی کہاوت اس طرح سے ہے کہ درخت لگانے کا بہترین موقع بیس سال قبل تھا، دوسرا بہترین موقع آج ہے۔ درحقیقت یہ ایک انتہائی حکیمانہ قول ہے۔ اس میں زندگی کی دو عظیم ترین حقیقتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جن کے بارے میں بہت کم لوگ حساس ہوتے ہیں۔

پہلی حقیقت کا تعلق تعمیری کام سے ہے۔ اس کہاوت میں درخت لگانے کا عمل دراصل تعمیری کام کا استعارہ ہے۔ درخت لگانے سے مراد کوئی بھی تعمیری عمل ہے۔ ایک درخت اپنے آغاز پر ایک چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ اس وقت اس پودے کو ہر طرح کی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نگہداشت کے اس طویل عرصے میں نہ پھل ملتا ہے نہ سایہ، نہ لکڑی ملتی ہے نہ پھول۔ لیکن جب نگہداشت کا یہ وقت گزر جاتا ہے اور آخر کار پودا درخت بن جاتا ہے تو پھر وہ ہر طرح کی پیداوار دینے لگتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ ہر تعمیری کام کا ہے۔ شروع میں یہ تعمیری کام یک طرفہ طور پر محنت، مشقت، صبر اور نگہداشت چاہتا ہے۔ اس دوران میں مطلوبہ نتائج کم ہی سامنے آتے ہیں۔ لیکن جب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو پھر ہر طرح کے مثبت نتائج سامنے آنے لگتے ہیں۔

بچوں کی پرورش سے لے کر گھر بنانے تک اس تعمیری عمل کی مثالیں روزمرہ زندگی میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ مگر ہم لوگ فرد اور قوم کی مجموعی تعمیر و ترقی کے معاملے میں اس معاملے کو اکثر بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا بچہ ایک دم نیک بن جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اچانک بہت سارے پیسے آ جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم ایک ہی جست میں اس دنیا کی غالب قوم بن جائے۔ ہماری خوش گمانیوں کی یہی وہ مثالیں ہیں جن کی نفی یہ کہاوت کرتی ہے۔

یہ کہاوت بتاتی ہے کہ اگر ہمیں اپنی اور اپنے بچے کی کردار سازی کرنی ہے تو اس کے لیے ایک

طویل اور صبر آزما جدوجہد کرنا ہوگی۔ اگر ہمیں اپنے معاشی معاملات کو بہتر کرنا ہے تو اس کے لیے کوشش، جدوجہد، منصوبہ بندی اور مواقع کے انتظار کے صبر آزما مراحل سے گزرنا ہوگا۔ ہم اگر اپنی قوم کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں کسی عظیم لیڈر کا انتظار بند کرنا ہوگا جو اچانک آسمان سے اترے یا زمین سے کہیں نمودار ہو کر ایک دم سے چیزیں ٹھیک کر دے۔ اس کے لیے ہمیں برسہا برس کی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے مجموعی قومی مزاج کو درست کرنا ہوگا۔

دنیا پر حکومت کرنے والا مغرب اس مقام پر صدیوں میں پہنچا ہے۔ مغرب کے ورثے کو اپنا کر چینی اقوام کو بھی اس مقام پر پہنچنے میں کم از کم ایک نسل یا بیس برس کا انتظار کرنا پڑا ہے۔ دو چار سال میں قوموں کی زندگی میں کچھ نہیں ہوتا۔ یہ وہ بات ہے جو ہماری قوم کو سمجھنا چاہیے۔

دوسری بات اس کہاوت میں یہ کہی گئی ہے کہ اگر بیس برس پہلے آپ نے اپنی انفرادی و اجتماعی تعمیر کا آغاز نہیں کیا تو مایوس نہ ہوں۔ بلکہ جان لیں کہ آج بھی اس کام کا بہترین موقع موجود ہے۔ آپ آج سے کوشش شروع کر دیں۔ اگلے بیس سال بعد آپ مطلوبہ نتائج پا لیں گے۔ لیکن اس کے برعکس رویہ اختیار کیا گیا تو پھر مایوسی اور بے عملی کے بیس برس بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہوں گے جہاں آج کھڑے ہوئے ہیں۔

اس کی ایک سادہ ترین مثال ہمارے ہاں جمہوریت کی نفی ہے۔ ہم نے ہر دس برس بعد جمہوریت سے مایوس ہو کر آمریت کو خوش آمدید کہا۔ حالانکہ ہم تیس چالیس سال تک جمہوریت کو مسلسل کام کرنے دیتے تو آج پاکستان میں بڑے مستحکم ادارے، مضبوط روایات اور اصول پسند لیڈروں کی ایک طویل قطار موجود ہوتی۔ تاہم ہم نے آج تک یہ نہیں کیا تو ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ ہم صبر کے ساتھ سسٹم کے پودے کو پانی دیتے رہیں۔ کانٹ چھانٹ کر کے اس کی خرابیاں دور کرنے کی کوشش کریں تو بیس سال بعد یہی سسٹم ہمیں بہترین لیڈر دے دے گا۔

# جمہوری عمل

پاکستان میں اگلا برس یعنی سن 2018 عام انتخاب کا سال ہوگا۔ یہ گویا کہ موجودہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی موجودہ مدت کا آخری برس ہے۔ چنانچہ تمام حکومتوں کی توجہ اب اس بات پر ہوگئی ہے کہ وہ الیکشن سے قبل زیادہ سے زیادہ ترقیاتی کام کرکے عوام کی نظر میں اپنا مقام بہتر بناسکیں۔ صوبہ سندھ کے شہری علاقے بالخصوص کراچی، جو پچھلے دس برسوں سے مسلسل نظرانداز کیا گیا اور اس کی بنا پر ایک کچرا کنڈی کی شکل اختیار کرگیا تھا، وہاں بھی صوبائی اور وفاقی حکومتوں نے اگلے برس کے لیے خصوصی بجٹ کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ اب کراچی میں وہ سڑکیں بھی بننا شروع ہوگئی ہیں جو دس برسوں سے بدترین ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر معاملات میں بھی بہتری کی کچھ نہ کچھ امید ہے۔

یہ ایک مثال ہے جو ہمارے اس موقف کی تائید کرتی ہے کہ جمہوری حکومتوں کا دورانیہ پانچ سال نہیں بلکہ تین سال ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ حکمرانوں کو جو کام کرنا ہوتا ہے وہ آخری برسوں ہی میں کرتے ہیں۔ اس لیے پانچ سال کی مدت قطعی غیر ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ صاحب نے بھی حکومتوں کی مدت چار برس کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ آواز باقی تمام لوگوں کو بھی اٹھانا چاہیے۔ اس سے نہ صرف جمہوری عمل میں مزید پختگی آئے گی بلکہ حکومتوں کی کارکردگی بھی بہتر ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی تعمیر ایک طویل کام ہے۔ لیکن چند ابتدائی اقدامات صورتحال کو جلد بہتر کرسکتے ہیں۔ ملک میں چھوٹے صوبوں کا قیام، منصفانہ الیکشن جس میں اخراجات کی حد کم سے کم رکھی جائے اور حکومتوں کی تین برس کی مدت وہ اقدامات ہیں جو پاکستان کو بہت جلد ترقی کے راستے پر ڈال سکتے ہیں۔ ہر باشعور شخص کو اس کے حق میں آواز اٹھانا چاہیے۔

# حق کے اعتراف کا درست وقت

حال ہی میں دیو بندی مکتب فکر کی تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے دو افراد کو بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے گستاخی رسول کے الزام میں مسجد میں سوتے ہوئے قتل کر دیا۔ بریلوی پس منظر کے چند لوگوں کو چھوڑ کر نہ کسی نے مقتولوں کی گستاخی کے جعلی ثبوت سوشل میڈیا پر عام کرنے کی کوشش کی نہ قاتل کو عاشق رسول قرار دے کر اس کی عظمت اور ولایت کا ڈھنڈورا پیٹا۔ نہ ''سر تن سے جدا'' کا مشہور عالم نعرہ بلند ہوا نہ یہ دھمکی سامنے آئی کہ قاتل کو انصاف کے کٹہرے میں لایا گیا تو آسمان و زمین ایک کر دیا جائے گا۔ نہ قانون ہاتھ میں لینے کی توجیہہ و تاویل کرنے کی کوئی کوشش کی گئی نہ قاتل کی حمایت میں کوئی زوردار مہم چلائی گئی۔

یہ ایک بڑی مثبت صورتحال ہے جس کی تحسین کی جانی چاہیے۔ تاہم اس صورتحال کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری قوم ایک ہی جست میں جذباتیت سے نکل کر معقولیت کے دور میں داخل ہوگئی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوا کہ لوگوں میں یک لخت خدا خوفی پیدا ہوگئی ہے۔ قانون شکنی پر تنقید کرنے والوں، دین کا نقطہ قرآن مجید اور سیرت نبوی سے سمجھانے والوں پر اگر اس دفعہ الزام و دشنام کی بارش نہیں ہوئی تو اس کی وجہ بھی یہ نہیں کہ معاشرے میں برداشت پیدا ہوگئی ہے۔ اس صورتحال کی جو وجہ ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بیان کرنے کی شاید ضرورت نہیں ہے۔

مگر یہ صورتحال دیکھ کر مجھے قیامت کے دن کے حوالے سے قرآن مجید کے کچھ بیانات یاد آ گئے۔ ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ واضح دلائل سامنے آنے کے باوجود اِس دنیا میں حق کو جھٹلاتے رہے ہیں، وہ سب لوگ روزِ قیامت حق کے اعتراف میں سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ دنیا میں اپنے غلط رویے کی جو جھوٹی تاویلیں وہ کرتے رہے تھے وہ آندھی کے دن اڑ جانے والی خس و خاشاک کی طرح غائب ہو چکی ہوں گی۔ مگر اس روز ان کا اعتراف ان کے کچھ کام نہ

آئے گا۔ حق کے اعتراف کی ساری قدر و قیمت بس اسی وقت تک ہے جب تک وہ دلیل کی بنیاد پر کیا جائے۔ مجبوری میں کیا جانے والا اعتراف کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

جو شخص قرآن مجید کے ان بیانات کو سمجھ لے وہ تڑپ اٹھے گا۔ وہ ہر سچائی کا اعتراف صرف دلیل کی بنیاد پر کرنے کو اپنی عادت بنائے گا۔ وہ تعصّبات سے اوپر اٹھ کر حقائق کی بنیاد پر فیصلے کرنے کو اپنا معمول بنائے گا۔ وہ جذباتیت کے بجائے معقولیت کا راستہ اختیار کرے گا۔ وہ جھوٹ، الزام، بہتان اور شور و غوغا کے بجائے مکالمے، گفتگو اور بات سمجھنے سمجھانے کی روش اختیار کرے گا۔ وہ ایک نتیجہ فکر پر پہنچنے کے باوجود بھی دوسروں کی بات کی سچائی کا امکان تسلیم کرے گا۔ وہ دوسروں کی بات کو غلط سمجھنے کے باوجود اپنی غلطی کے امکان کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ وہ خود کو انسان سمجھ کر اپنا فہم بیان کرے گا، نبی اور رسول سمجھ کر خدائی لہجے میں حق و باطل کے فیصلے نہیں دے گا۔

جب یہ رویہ عام ہو جائے گا تو ہمارے معاشرے سے ہر طرح کی انتہا پسندی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ تعصّبات اور فرقہ واریت ختم ہو جائے گی۔ کفر، شرک، گستاخی کے فتووں کی گرم بازاری ماند پڑ جائے گی۔ نفرت، عدم برداشت اور اختلاف رائے کے حق سے انکار کی سوچ مدھم ہو جائے گی۔

رحمت اللعالمین کے امتیوں کے ہاتھوں دوسرے امتیوں کی جانیں گستاخی رسول کے الزام میں جائیں، اس سے بڑا سانحہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس سانحے کے نتیجے میں لوگوں پر اپنے انداز فکر کی غلطی واضح ہو جائے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ مگر جو لوگ اس کے باجود اپنی غلطی پر ڈھٹائی کے ساتھ قائم رہتے ہیں، وہ اپنے بارے میں صرف ایک بات بتا رہے ہیں، وہ یہ کہ ان کی ناؤ اب بھر کر ہی ڈوبے گی۔

یہ وہ دن ہو گا جس دن حق کسی دلیل کے ساتھ نہیں بلکہ فرمان رب کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس روز نہ کسی کی توبہ کام آئے گی، نہ اس کی ندامت ہی اس کو کچھ نفع دے گی۔

# قوم اور حکمران

یہ ساٹھ کی دہائی کا اخیر ہے۔ ایوب خان کے خلاف تحریک نقطہ عروج پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر خرابی کی جڑ ایوب خان ہیں اور ان کے جانے سے ملک جنت بن جائے گا۔ ایوب خان چلے گئے، ملک بدستور جہنم بنا رہا۔

ستر کی دہائی کا اخیر ہے۔ جن بھٹو صاحب نے ایوب کے خلاف تحریک چلائی تھی، اب ان کے خلاف ہی ایک تحریک چل رہی ہے۔ بھٹو کے ظلم و ستم کی داستانوں کی صدا ہر جگہ عام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بھٹو ایک شیطان ہے جس کے جاتے ہی ملک جنت کا نقشہ پیش کرنے لگے گا۔ بھٹو رخصت ہو گئے، ملک کے حالات بدتر ہو گئے۔

اسی کی دہائی کے اخیر میں بھٹو کو پھانسی دلوانے والے ضیاالحق کے خلاف بھی ایسے ہی جذبات تھے، مگر ان جذبات کے ابلنے سے قبل ہی وہ ایک فضائی سفر میں اگلی دنیا کو سدھار گئے۔ اس کی کسر نوے کی دہائی میں دو دو مرتبہ بے نظیر اور نواز شریف کو قوم و ملک کا ولن ثابت کر کے پوری کر دی گئی۔ مگر ان سب کے جانے کے بعد بھی ملک وہی رہا۔

بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں یہی نفرت پرویز مشرف کے لیے پیدا کی گئی۔ سارے عیب انھی میں جمع ہو گئے۔ مگر ان کی رخصتی کے بعد ملک کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ پانچ سال بعد یہی نفرت زرداری صاحب کے لیے پیدا ہو گئی اور اب نواز شریف کے خلاف اس قوم کے دانشوروں نے وہی محاذ باندھ دیا ہے کہ وہ غدار، ملک فروش اور کرپٹ ہیں......اور عدالت نے کس جرم میں نااہل قرار دیا ہے؟ اپنی وہ تنخواہ جس کو لیا ہی نہیں، اثاثوں میں کیوں نہیں دکھائی۔

ساٹھ برسوں کی یہ تاریخ جتنے سوالات ملک کی سیاسی اور فوجی قیادت کے بارے میں پیدا کرتی ہے، اس سے کہیں زیادہ سوالات اس ملک کے اہل دانش، ان کی سوچ اور فہم و فراست

کے بارے میں اٹھا دیتی ہے۔تاہم ان نام نہاد اہل دانش کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم اصل مسئلے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کی سادہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا بگاڑ اجتماعی اور ہمہ گیر ہے۔ ہماری حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مفاد کے معاملے میں کسی اصول، قانون کی کسی حکمرانی، کسی دیانت، کسی امانت، کسی سچائی اور کسی قدر کو نہیں مانتا۔ جہاں اپنا مفاد ہو، خواہش اور تعصب ہو، وہاں ہر شخص صداقت اور امانت دونوں کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ سڑک پر بے ہنگم ڈرائیونگ، سرکاری دفتروں میں ہر طرح کی کرپشن، پولیس اور عدالت میں انصاف کا کھلا قتل، دہشت گردوں کی علانیہ اور خاموش حمایت، پورنوگرافی دیکھنے میں ہمارا دنیا کے ٹاپ ممالک میں سے ایک ہونا؛ چند مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اخلاقی لحاظ سے بحیثیت قوم ہم کہاں کھڑے ہیں۔

دوسری طرف تاریخ کا سبق ہے کہ معاشرہ بگڑ جائے تو حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ راشد بھی بگاڑ کو ٹھیک کرنے کے بجائے اس کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھتے ہیں۔ مذہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت سے بھرا ہوا ہے کہ جب تمھارے حکمران بگڑ جائیں تو ان کی نفرت کو فروغ دے کر ان سے ٹکرانے کے بجائے قوم کی اصلاح میں لگ جاؤ۔

ہمارے اسلاف نے اس ہدایت کو یاد رکھا اور دورِ آمریت میں رہتے ہوئے بھی صدیوں تک حکمرانوں کا بگاڑ عوام میں نہیں آنے دیا۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ حکمران تو ایک کے بعد ایک بدلتے گئے، مگر قوم کی حالت بہتر نہیں ہوسکی۔ کاش ہم اس جمہوری دور میں حضور کی ہدایت کو یاد رکھتے اور حکمرانوں کی نفرت کو فروغ دینے کے بجائے برائی کی نفرت عام کرتے تو معاشرے سے برے لوگ کم ہوتے چلے جاتے۔ جس کے بعد اچھی قوم بچتی اور اچھی قوم پر کبھی برے حکمران مسلط نہیں رہ سکتے۔ جس طرح یہ حقیقت ہے کہ ایک بری قوم کو برے حکمران ہی ملا کرتے ہیں۔

## نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری

علامہ اقبال کا شمار دورِ جدید کے عظیم ترین مسلم مفکرین میں ہوتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی فکری تاریخ میں مجتہدانہ ذہن رکھنے والے آخری مقبول لیڈر تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے کی مروجہ فکر سے ہٹ کر مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کی خوش قسمتی تھی کہ چند مستثنیٰ تنقیدوں کو چھوڑ کر، ان کی یہ فکر عمومی طور پر قبول کر لی گئی۔

ان کی فکر کا ایک پہلو تصوف کے اس رخ پر زبردست تنقید تھی جو رہبانیت اور ترک دنیا کی تعلیم دیتا تھا۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی جیسی کتابوں کا یہ اہم موضوع تھا۔ اردو شاعری اور ان کے مکاتیب میں بھی جا بجا ان کی یہ تنقید نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ زبور عجم میں کہتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری

اقبال تو گزر گئے مگر بدقسمتی سے ان کا یہ مصرعہ کہ ’’نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری‘‘ بعض لوگوں نے اچک لیا اور جب بھی دین کی صحیح دعوت ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے، وہ اس ’’خانقاہی طرز فکر‘‘ کی پھبتی کس کر اقبال کا یہ مصرعہ نقل کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے اس طرح کے لوگ اقبال سے تو کیا واقف ہوتے، وہ اس مصرعے کے بعد دوسرے مصرعے اور اگلے شعر سے بھی واقف نہیں ہوتے، مگر پورے اعتماد سے ایک مصرعہ پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے قرآن و حدیث کی واضح ترین ہدایات کا رد کر دیا۔ حالانکہ جو اشعار ہم نے پیچھے نقل کیے ہیں وہی اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ اقبال کی اصل تنقید بے عملی، جمود اور رہبانیت پر تھی۔

رہی ''رسم شبیری'' تو حقیقت یہ ہے کہ اس کا حقیقی مطلب مراد لیا جائے یعنی حضرت حسین کی طرح جنگ اور اس میں اپنی ذات اور خانوادے کی جان قربان کر دینا تو یہ کام تو خود حضرت اقبال نے بھی نہیں کیا حالانکہ ان کی ساری زندگی برٹش راج میں انگریزوں کی غلامی اور ہندوستان پر ان کے قبضے کے دور میں گزری ہے۔ انھوں نے مغرب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انگریز سرکار سے ''سر'' کا خطاب پایا۔ انھوں نے جو کچھ جدوجہد کی وہ انتہائی پر امن سیاسی اور فکری جدوجہد تھی۔

یہ تو ممکن نہیں کہ اقبال جیسا بڑا آدمی منافقت کا مظاہرہ کرے۔ اس لیے ایک ہی امکان ہے کہ اقبال کی بات کو ٹھیک نہیں سمجھا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ''رسم شبیری'' کو اقبال نے بطور ایک استعارے کے استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان معاشرے کے خیر و شر سے لاتعلق ہو کر نہ بیٹھ جائے اور ترک دنیا کے رویے کو چھوڑ کر زندگی کے عملی میدان میں اترے اور اجتماعی بہبود کے لیے جدوجہد کرے۔ یہ کام اقبال نے ساری زندگی کیا ہے اور یہی ان کی مراد بھی تھی۔ یہی بات ہے جو ان اشعار کو پورا پڑھنے سے بھی سمجھ میں آ جاتی ہے۔

یہی درحقیقت ہمارے دین کی تعلیم بھی ہے۔ ہمارے دین نے ہمارے لیے جو مقصد منتخب کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنے نفس کا تزکیہ کیا جائے، (الشمّس 9:91)۔ اہل ایمان پر صرف ان کے اعمال کی ذمہ داری ہے، (المائدہ 105:5)۔ دوسروں کے حوالے سے مسلمانوں کو جو ذمہ داری دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو حق کی تلقین اور اس پر ثابت قدمی کی تاکید کریں (العصر)۔ اسی ذمہ داری کو دوسرے مقامات پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔

قرآن مجید کی سورہ العصر اس پر شاہد ہے کہ جس شخص نے ایمان، عمل صالح اور تواصوا بالحق والصبر کا یہ کام کر لیا وہ آخرت کے خسارے سے نجات پا جائے گا۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔ جو لوگ قرآن کا فیصلہ قبول نہیں کرتے ان کے حصے میں آخرت کی ندامت کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

# ایک مرد جلیل کا سانحہ رحلت

شیخ محمد الیاس صاحب کی رحلت میرے لیے ایک ذاتی نقصان کی حیثیت رکھتی ہے۔ان کے انتقال سے میں صرف ایک مربی اور بزرگ کی سرپرستی اور دعاؤں ہی سے محروم نہیں ہوا بلکہ ماضی کی اس تہذیب سے بھی میرا ایک ربط ختم ہو گیا جس کا وہ زندہ اور چلتا پھرتا تعارف تھے۔

الیاس صاحب کی شخصیت اور زندگی کے گوناگوں پہلو تھے جن کے بارے میں شاید دوسروں کو بتانا ضروری ہے،مگر تنگیِ صفحات کی بنا پر دو تین اہم چیزوں کا احاطہ ہی ممکن ہے۔

الیاس صاحب دہلی کی اس تہذیب کا نمونہ تھے جو شرفائے دہلی کی تہذیب کہلاتی تھی۔اس میں رکھ رکھاؤ، ادب، نفاست، حفظ مراتب اور ہر قدم پر دوسروں کا اعتراف اور لحاظ شامل تھا۔ یہ تہذیب اور رکھ رکھاؤ خاندانی دولت مندوں میں ہی ہوا کرتی ہے۔موجودہ دور میں اچانک دولت مند ہو جانے والوں میں یہ تہذیب، رکھ رکھاؤ، عالی حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ان کی ساری تگ و دو دولت کمانے، اس کی نمود و نمائش کرنے اور دوسروں کو مرعوب کرنے تک محدود رہتی ہے۔دوسروں کی مدد، ان کی عزت اور لحاظ ایسے لوگوں میں نہیں ملتا۔

الیاس صاحب کا خاندان دہلی کے بہت خوشحال گھرانوں میں سے تھا۔تقسیم سے قبل کے زمانے میں گاڑی اور ڈرائیور عام گھرانوں کا معمول نہ تھا۔مگر وہ بتاتے تھے کہ ان کے ہاں بگھی اور گاڑی دونوں تھیں۔ایک دفعہ ان کے چچا نے شوق میں ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کی تو والد نے ان کو ڈانٹا کہ تمھیں تو کوچوان بننے کا شوق ہے۔دہلی سے پاکستان آ کر بھی ان کے خاندان کی یہی صورتحال تھی۔الیاس صاحب نے اسی فراغت میں زندگی کا آغاز کیا۔ان کا طرز زندگی بہت امیرانہ تھا۔ایک ایسے دور میں جب لوگ صرف حج کے لیے پاسپورٹ بنواتے تھے، الیاس صاحب نے ساٹھ کی دہائی میں جبکہ وہ ایک نوجوان تھے، متعدد ممالک کی سیاحت کر لی۔تاہم سن

اکہتر کی جنگ کے بعد ان کا خاندان عرش سے فرش پر آ گیا کیونکہ ان کا سارا کاروبار مشرقی پاکستان میں تھا۔تمام کاروبار اور زمینوں پر مقامیوں کا قبضہ ہو گیا اور یہ لوگ خالی ہاتھ ہو گئے۔

یہیں سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جنگ کتنی بری چیز ہوتی ہے۔جنگ طاقتور ملکوں اور طاقتور طبقات کے لیے بہت مفید مگر کمزور اقوام اور کمزور طبقات کے لیے تباہ کن چیز ہے۔عام آدمی چونکہ سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے، اس لیے کسی بھی جنگ کی صورتحال میں سب سے زیادہ تباہی اسی کے حصے میں آتی ہے۔اسی کی جان، مال، آبرو اور گھر برباد ہوتا ہے۔اس لیے عوام الناس کو ہمیشہ ہر قسم کے جنگی جنون میں یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اس کی اصل قیمت ان ہی کو دینی ہوگی۔

کاروبار کے خاتمے کے بعد کے حالات الیاس صاحب کے لیے بہت تکلیف دہ رہے۔مگر اس کے باوجود نفاست، رکھ رکھاؤ اور تہذیب میں کوئی فرق نہیں آیا۔ہم نے ہمیشہ ان کو سفید براق کلف لگے ہوئے کپڑوں ہی میں دیکھا۔گفتگو میں سلیقہ، مخاطبین کی عزت و مرتبے کا لحاظ، دوسروں کا اعتراف لیکن اس کے باوجود اپنے نقطہ نظر کو جرات اور ہمت سے بیان کرنا ہمیشہ ان کے اوصاف رہے۔

انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق آرٹیفیشل جیولری کی ایک دکان کر لی تھی۔میرے متعلق انھیں معلوم تھا کہ کینیڈا سے اپنی جاب اور امیگریشن چھوڑ کر آیا ہوں۔میری اس وقت بالکل نئی نئی شادی ہوئی تھی اور اس صورتحال میں سب سے بڑا امتحان میری اہلیہ کا ہوا تھا۔چنانچہ ہمیشہ وہ ان کا خصوصی خیال کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ان کے لیے اپنی دکان کی قیمتی جیولری بھجواتے رہتے تھے۔ میں اپنی مصروفیات کی بنا پر عام طور پر لوگوں سے کم ہی رابطہ کرتا ہوں۔مجھ سے وہ ہمیشہ یک طرفہ طور پر رابطے میں رہتے تھے۔مجھے نہیں یاد کہ کبھی انھوں نے مجھ سے کوئی شکایت یا شکوہ کیا ہو کہ تم فون کیوں نہیں کرتے۔یہ بہت ساری مثالوں میں سے چند ایک ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ وہ کس درجہ

تہذیب یافتہ اور رکھ رکھاؤ والے آدمی تھے۔

انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کراچی کو تہذیب کے زندہ نمونے سے لے کر ایک کھنڈر اور مقتل بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بڑے تاسف سے کراچی کی داستان سنایا کرتے تھے کہ کس طرح تقسیم سے قبل ہندوستان کی انتہائی دولت مند پارسی کمیونٹی نے کراچی کو اپنا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا اور ہندوستان بھر سے دولت اور تہذیب سمٹ کر یہاں آنے لگی۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں پارسی کالونی کے نام سے کراچی کی پہلی پوش رہائشی اسکیم قائم کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کراچی ایک ترقی یافتہ اور جدید شہر بن گیا۔

تقسیم ہند کے بعد کراچی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست پاکستان کا دارالخلافہ قرار پایا۔ یوں کراچی کا مقدر عروج پر پہنچ گیا۔ گرچہ اس موقع پر مقامی ہندو آبادی کا بڑا حصہ یہاں سے ہندوستان منتقل ہوا، لیکن دہلی، لکھنؤ اور یوپی سے آنے والی مسلم آبادی نے اس خلا کو بھر دیا۔ آنے والے لوگ خود تہذیبی طور پر ہندوستان کا گل سرسبد تھے۔ یوں کراچی سیاسی پہلو کے علاوہ تہذیبی اور ثقافتی طور پر نئے ملک کا ایک اہم علمی و ادبی مرکز بن گیا۔ پچاس اور ساٹھ کی دہائی تک یہ شہر تہذیب، تمدن، علم و فن، امن، دولت اور ترقی کا مرکز تھا۔ الیاس صاحب نے اپنی جوانی میں اسی کراچی کو دیکھا تھا اور وہ اکثر اس کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کرتے تھے۔ اس دور کے جو واقعات وہ سناتے تھے آج کے دنوں میں تو وہ ناقابل یقین لگتے ہیں۔

مگر بدقسمتی سے پاکستان کی انتہائی خودغرض لیڈر شپ نے اپنے ذاتی مفادات کے تحت اس شہر کو تباہ کرنے کا عمل شروع کیا جس کے نتائج پورے ملک کو بھگتنے پڑے۔ سب سے پہلے ایوب خان نے یہاں سے دارالحکومت منتقل کیا۔ پھر بھٹو نے قوم پرستانہ نفرت کا بیج بویا۔ پھر ضیاء الحق نے لسانیت کو فروغ دیا۔ اس کے بعد کی تباہی تو موجودہ نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔

اس زوال مسلسل کی وجہ سے اس شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ لوگ یہاں سے ہجرت کرتے رہے۔ پہلے ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں میں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نے دنیا کے مختلف ممالک میں ہجرتیں کیں۔ پھر پارسی کمیونٹی نے ملک چھوڑ کر کینیڈا کو مرکز بنالیا۔ اسی کے ساتھ اینگلو انڈین اور دیگر غیر ملکی قومیتوں کے تعلیم یافتہ لوگ یہاں سے ہجرت کر کے بیرون ملک منتقل ہوتے رہے۔ دوسری طرف سیاسی اور معاشی بنیادوں پر پاکستان بھر سے غیر تعلیم یافتہ طبقات کراچی منتقل ہوئے یا انھیں منتقل کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں آبادی میں تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ بہت کم رہ گئے اور یوں اس شہر کا تہذیبی چہرہ اپنی پرانی شکل برقرار نہ رکھ سکا۔

الیاس صاحب کراچی کی اس تباہی کا سبب یہ بتاتے تھے کہ اس شہر کے باسیوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم اور بلند شعور کی بنا پر حکومتوں کے خلاف مسلسل اپوزیشن کا کردار ادا کیا۔ ایوب خان سے بھٹو تک یہ شہر اپوزیشن کا گڑھ تھا۔ چنانچہ اس شہر کے باسیوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا اور آج کے دن تک یہ سزا ختم نہیں ہوئی ہے۔ الیاس صاحب اس پوری صورتحال پر کڑھتے اور افسوس کرتے تھے۔

الیاس صاحب کی صحت کئی برس سے خراب تھی، مگر وہ بڑی ہمت سے نارمل زندگی گزارتے رہے۔ مگر چند ماہ قبل ان کی اہلیہ کو کینسر کا آخری اسٹیج تشخیص ہوا۔ ان کے لیے یہ صدمہ بہت زیادہ تھا۔ اس نے ان کی وہ ہمت توڑ ڈالی جو بدترین حالات بھی نہیں توڑ سکے تھے۔ رمضان کے آخری دن ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا اور اس کے دو ہفتے بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انھوں نے بدترین حالات دیکھنے کے باوجود جس اعلیٰ انسانی اور اخلاقی سطح پر زندگی گزاری، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید اور دعا ہے کہ آخرت کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے اس مومن بندے کو اہل جنت کی اشرافیہ میں شامل فرمائیں گے۔ آمین۔

-----------------

سیّد اسرار احمد

# نسبت کا فرق

ایک جگہ پولیس کا ناکہ لگا ہوا تھا، ہر آنے جانے والے شخص کی جامہ تلاشی لی جا رہی تھی۔ معلوم ہوا یہ شاہراہ عام نہیں ہے اور سیکیورٹی وجوہات کی وجہ سے ہر ہمہ شُمہ کو وہاں سے گزرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اتنے میں ایک مسافر بس کا وہاں سے گزر ہوا، پولیس اہلکاروں نے مسافر بس کو اشارے سے روک لیا، تمام مسافروں کو بس سے اتار کر ان کی تلاشی لی گئی۔ انہی مسافروں میں سے کچھ لوگ فوج سے تعلق رکھتے تھے، وہ چونکہ سِول لباس میں تھے اس لیے پولیس اہلکار انہیں پہچان نہیں سکے۔ جونہی ایک پولیس اہلکار نے ایک فوجی کی تلاشی لینا چاہی، مذکورہ فوجی نے اپنا آئی ڈی کارڈ دکھایا اور بتایا کہ اس کا تعلق آرمی سے ہے۔ کارڈ دیکھتے ہی پولیس والے کے آگے بڑھے ہاتھ پیچھے ہٹ گئے اور اس نے تلاشی لینے کے بجائے اس فوجی کو سلیوٹ کیا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ اس بس میں اور کتنے لوگ سوار ہیں؟

فوجی نے بتایا کہ اس کے ساتھ فلاں فلاں رینک کے تین فوجی مزید ہیں اور ایک چپراسی بھی ہے، جو ان کے ساتھ شریک سفر ہے۔ چنانچہ مذکورہ فوجی کی نشاندہی پہ چپراسی سمیت باقی کے چار افراد کو بھی عام مجمعے سے الگ کر لیا گیا اور بلا روک ٹوک جانے دیا گیا۔

ان پانچ اشخاص کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ کیوں کیا گیا؟ اس کی وجہ سادہ طور پر 'نسبت کا فرق' ہے۔ مسافر تو اور بھی بہت سے تھے لیکن ان کے ساتھ ایسی کوئی نسبت نہیں تھی جس کے سبب انہیں کسی خصوصی پروٹوکول سے نوازا جاتا۔ اس لئے انہیں روک کر فوجی اہلکاروں کو جانے دیا گیا۔

نسبت ہی کے فرق کی وجہ سے ایک چپراسی لیول کے شخص کے ساتھ بھی صرف فوج سے تعلق

ہونے کی بنیاد پر عام لوگوں سے الگ معاملہ کیا گیا۔

نسبت اور تعلق کے فرق کی مثالیں جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ آپ گندم یا چاول کی بوری خریدتے ہیں اس میں اناج کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کنکر بھی تول میں شامل ہو کر اناج کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اپنی حقیقت میں گرچہ وہ کنکر تو ہیں لیکن چونکہ بوری کا حصہ ہیں، اس لیے اناج میں شامل سمجھے جاتے ہیں اور خاک ہونے کے باوجود اپنی ''نسبت'' کی وجہ سے اناج ہی کے مول بِک جاتے ہیں۔ اسی طرح جب گیہوں کو پیسنے کا کام کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ گھن بھی پِس کر اصل اناج کا حصہ بن جاتا ہے۔

دنیا میں پتھر تو بہت سے ہیں، پتھر تو وہ بھی ہے جو بیت اللہ میں نصب ہے اور پتھر وہ بھی ہے جو بیت الخلا میں نصب ہے لیکن بیت الخلا کے پتھر سے لوگ دامن بچا کے چلتے ہیں جبکہ بیت اللہ کے پتھر پر اپنی جبیں رکھ کر خُدا کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ حالانکہ دونوں اپنی خلقت کے اعتبار سے ''پتھر'' ہی ہیں، لیکن ایک پتھر پر مراسمِ عبودیت ادا کیے جاتے ہیں اور دوسرے سے کراہیت کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ بھی سادہ طور پر نسبت کا فرق ہے جس کے سبب ایک پتھر کو دوسرے کے مقابلے میں یہ مقامِ تقدس ملا۔

نسبتوں کی اس بھیڑ میں ایک نسبت ایسی بھی ہے جسے ہم 'دعوتِ دین کی نسبت' کہتے ہیں۔ لوگ تو اور بھی بہت سے ہیں، نسبتیں بھی سینکڑوں ہیں جن پر وہ نازاں ہوتے ہیں اور ان نسبتوں کے سبب وہ خصوصی پروٹوکول سے نوازے جاتے ہیں۔ لیکن ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جب دنیا کی تمام نسبتیں بے وقعت و بے حیثیت گردانی جائیں گی، عظمت و بڑائی کے سارے مینار جس دن ڈھا دیے جائیں گے، لکھے ہوئے طومار لپیٹ کر رکھ دیے جائیں گے۔ دنیا میں عزت و بڑائی کے منصب پر بیٹھنے والے اس دن کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر سمجھے جائیں

گے، نفسانفسی کے عالم میں جبکہ کوئی نسبت، کوئی تعلق کسی کام نہیں آئے گا، خوف کے مارے کلیجے مُنہ کو آ رہے ہوں گے۔ ایسے عالم میں ایک مُنادی پکارے گا، ''کہاں ہیں وہ لوگ جو دنیا میں صرف دین کی نسبت سے پیسے گئے اور تکلیف دیے گئے، کہاں ہیں وہ لوگ جنہیں دعوت دین کی وجہ سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا، ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا، ان کی عزتیں اچھالی گئیں، آج زمین کی بادشاہی انہی کے نام ہے۔''

ایک مجمع پھٹے گا، کہرام مچ جائے گا کہ یہ کون ہیں؟ لوگ محوِ حیرت ہوں گے، مجمعے میں سے ایک ایک کر کے لوگ الگ الگ ہونا شروع ہوں گے، معلوم ہوگا کہ اللہ کے دین کا کام کرنے والوں میں جہاں جلیل القدر انبیاء و پیغمبر مجمعے سے الگ کیے جا رہے ہونگے، جہاں صحابہ و صدیقین کی قطاریں بن رہی ہوں گی، وہیں صرف اس اعلیٰ و اونچے درجے کے کام (دعوت دین) سے نسبت ہونے کی وجہ سے ہم جیسے چپراسی بھی اپنی تمام تر بے حیثیتی و بے وقعتی کے باوجود صرف نسبت کی وجہ سے اس مجمعے کا حصہ بن جائیں گے۔

ہم خاک سے بھی زیادہ بے حیثیت و بے وقعت لوگ پیغمبروں کے کام سے معمولی نسبت ہونے کی وجہ سے کنکر ہو کر بھی اناج کے مول بِک جائیں گے۔

یہ دنیا ایک دن......... بلکہ بہت جلد ختم ہونے والی ہے........ دیر تک باقی رہنے والے کاموں میں لگے رہنے والوں کو نوید ہو کہ وقت قریب آ لگا ہے، بہت قریب!

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

انسان کو ہمیشہ اس کی تقدیر ملتی ہے
مگر اس تقدیر تک انسان کو چل کر جانا پڑتا ہے

محمد عامر خاکوانی

# سیاستدان بمقابلہ اسٹیبلشمنٹ

آج کا موضوع دلچسپ ہے کہ ہمارے سیاستدانوں اور اسٹیبلشمنٹ کے مابین لڑائی عرصے سے چلی آ رہی ہے۔ سیاستدان یہ شکوہ کرتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ انہیں کام نہیں کرنے دیتی اور اصل اختیار اس کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ حال ہی میں نااہل ہونے والے میاں نواز شریف اس حوالے سے آج کل خاصی تلخ گفتگو فرما رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اسٹیبلشمنٹ منتخب وزیراعظم کے مینڈیٹ کا احترام نہیں کرتی۔ میاں صاحب کے ساتھی کھل کر یہ کہتے ہیں کہ اسٹیبلشمنٹ حکومتوں کو کام نہیں کرنے دیتی، سازشیں ہوتی رہتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چیئرمن سینیٹ رضا ربانی کمال کے آدمی ہیں، اصول پسند اتنے کہ فوجی عدالتوں کے قانون پر دستخط کرتے ہوئے آنجناب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، یہ اور بات کہ جب ان کی پارٹی کی حکومت نے ملک کا بیڑا غرق کیا، ایک ایک کر کے قومی ادارے دیوالیہ کیے، تب موصوف کے چہرے کی مسکراہٹ تروتازہ رہی۔ خیر سیاستدان بمقابلہ اسٹبلشمنٹ والی تھیوری پر بات کرتے ہیں، مگر پہلے کچھ علمی، کتابی باتیں بھی پڑھ لیں۔

کبھی آپ نے اس پر غور کیا کہ عوام اپنے نمائندے کیوں چنتے ہیں، حکومت کس لیے بنائی جاتی ہے اور اس کا کیا کام ہے؟ اسی نکتے پر غور کریں تو بہت سی باتیں صاف ہو جاتی ہیں۔ ماہرین حکومتوں کی چند بنیادی ذمہ داریاں گنواتے ہیں، جو انہیں ہر حال میں عوام کے لیے نبھانا پڑتی ہیں۔

1۔ لوگوں کی جان و مال کا تحفظ یعنی لا اینڈ آرڈر 2۔ تعلیم اور صحت کی بہترین سہولتیں

3۔ صاف پانی 4۔ روزگار 5۔ نقل و حرکت کے لیے مناسب انفراسٹرکچر

6۔ سستا اور تیز رفتار انصاف 7۔ زندگی میں آگے بڑھنے کے مساوی مواقع

8۔ دنیا میں ایک باوقار قوم کے طور پر شناخت

ریاست یا حکومت اپنے عوام کو یہ سب چیزیں دینے کی ضمانت دیتی ہے اور اس کے بدلے میں عوام اسے اختیار اور اتھارٹی سونپتے ہیں اور اس کے قوانین ماننے کا عہد کرتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے معاہدہ عمرانی یا سوشل کنٹریکٹ کہتے ہیں۔ آئین دراصل سوشل کنٹریکٹ ہی ہے۔

ریاست اپنے لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے مختلف ادارے بناتی ہے۔ انصاف فراہم کرنے کے لیے عدالتیں بنائی جاتی ہیں، امن و امان قائم کرنے کیلئے پولیس اور دیگر قانون نافذ کرنے والے ادارے قائم ہوتے ہیں۔ تعلیم کے لیے سرکاری سکول، کالج، یونیورسٹیاں جبکہ علاج معالجے کے لیے سرکاری ہسپتال بنائے جاتے ہیں۔ نقل و حرکت کے لیے اچھی سڑکیں، موٹر وے، ہائی ویز وغیرہ بنتی ہیں اور صاف پانی کے لیے فلٹر پلانٹس وغیرہ۔ روزگار کے لیے ریاست مختلف ایسے منصوبے بناتی ہے، جن سے روزگار پیدا ہو، شرح ترقی تیز رکھی جائے تاکہ کاروبار مندے نہ پڑیں اور نجی سطح پر کام کاج ملتا رہے۔ ریاست کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ کلاس سسٹم کو کم کرے، امیر اور غریب کے مابین فرق زیادہ نہ بڑھے۔ یہ یقینی بنائے کہ امیر کی اولاد اور غریب کا بچہ دونوں کے لیے آگے بڑھنے کے مساوی مواقع موجود ہوں۔ اس لیے غریب مگر لائق ترین بچوں کو اسکالرشپس دی جاتی ہیں۔ ان سب کے لیے ضروری ہے کہ ریاست امیروں سے ٹیکس لے، جو ویلفیئر کے کاموں پر خرچ ہو سکے۔ ریاست کا ایک کام مستقبل کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اپنے ان شعبوں کو بہتر بنانا بھی ہے، جن کے ذریعے دنیا میں ممتاز ہوا جا سکے۔ مثال کے طور پر جن ممالک نے دس پندرہ برس پہلے آئی ٹی پر توجہ دی، وہ آج اربوں ڈالر اس کے ذریعے کما رہے ہیں، نالج اکانومی نے بہت سے ایسے نئے راستے کھول دیے ہیں، جن

کی طرف بروقت توجہ دینے والے دوسروں سے بہت آگے نکل سکتے ہیں۔

یہاں تک پڑھ لینے والے قارئین کے ساتھ معذرت کہ آج اکیڈیمک سطح کی گفتگو ہو رہی ہے، مگر بات کو سمجھانے کے لیے یہ ضروری تھا۔ اوپر دی گئی گڈ گورننس کی خوبیوں کو جاننے کے بعد واضح ہو گیا ہو گا کہ عوام کا مینڈیٹ لینے والے کسی بھی منتخب حکمران کو سب سے پہلے کیا کرنا چاہیے؟ جواب آسان ہے، اسے ملک میں امن وامان بہتر بنانے اور لوگوں کو جان، مال، عزت کا تحفظ فراہم کرنا چاہیے۔ شہری زندہ بچیں گے تو پھر باقی کام ہو سکیں گے۔ لا اینڈ آرڈر بہتر بنانے کا سادہ نسخہ ہے کہ ہر صوبے میں پولیس کو غیر سیاسی بنایا جائے۔ ایک بہترین، دیانت دار افسر کو آئی جی پولیس بنایا جائے، اسے مکمل اختیارات اور مالی وسائل دیے جائیں اور یقین دہانی ہو کہ کسی وزیر، ایم این اے، ایم پی اے کا اسے فون نہیں جائے گا۔ ٹرانسفر، پوسٹنگ میں سیاسی مداخلت نہیں ہو گی۔ پولیس کی نفری اور تنخواہ بڑھانی پڑے تو فوری عمل ہو۔ پولیس سے صرف نتائج مانگے جائیں۔ کرپٹ افسروں کو برطرف اور اچھے افسروں کی حوصلہ افزائی کا نظام وضع ہو۔ گلی محلے کی سطح پر پولیسنگ سسٹم مضبوط ہو۔ ایسا کرنے کی صورت میں چند ماہ کے اندر جرائم کی شرح میں نمایاں کمی آ جائے گی۔ عام آدمی کو تھانے سے ریلیف ملنا شروع ہو جائے تو اسے کسی رکن اسمبلی، چیئرمین، کونسلر کی سفارش لے کر جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

اسی انداز میں ہسپتالوں کو بہتر بنایا جائے، ہر بڑے شہر کے اندر میڈیکل کالج کے ساتھ منسلک بڑا ہسپتال ہوتا ہے جسے ٹیچنگ ہسپتال کہتے ہیں۔ جیسے لاہور میں میو، سروسز، گنگارام اور جناح ہسپتال کی صورت میں بڑے ٹیچنگ ہسپتال ہیں۔ ان کے ساتھ جنرل، چلڈرن، گلاب دیوی، کارڈیالوجی جیسے اہم ہسپتال بھی موجود ہیں، مختلف علاقوں میں دو چار اور ہسپتال بھی ہیں۔ یعنی لاہور کی سطح پر کل نو دس ہسپتال ہیں۔ کوئی بھی حکومت اگر طے کر لے کہ ان میں انقلاب لانا

ہے تو اسے صرف چھ آٹھ ماہ چاہیے ہوں گے۔ چند مستعد افسران جوان ہسپتالوں کے ہفتہ وار چکر لگاتے رہیں اور ایمرجنسی، آؤٹ ڈور پر نظر رکھیں، ڈاکٹروں کی حاضری یقینی بنائی جائے، دوائیاں مریضوں کو ملتی رہیں، لیب بہتر ہو، صفائی اچھی کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ یہی تجربہ تحصیل، ڈسٹرکٹ ہسپتالوں میں دہرایا جائے، ایک حیران کن تبدیلی ہزاروں لاکھوں مریضوں کو محسوس ہونے لگے گی۔

تعلیم کا نظام بہتر بنانے میں کچھ زیادہ وقت لگ جائے گا، کیونکہ وہاں تباہی بھی زیادہ ہوئی ہے، مگر بہرحال درست سمت میں سفر کا آغاز کرنے سے دو چار برسوں میں سرکاری سکول کی توقیر لوٹ آئے گی، کالجوں، یونیورسٹیوں کے معیار کو بہتر بنا لیا جائے گا۔ صاف پانی کی فراہمی میں اس سے بہت کم وقت صرف ہوگا۔ آسان ترین طریقہ تو یہ ہے کہ سرکاری عہدہ یا منصب سنبھالنے والے ہر شخص کے لیے یہ لازمی قرار پائے کہ اس کی اولاد سرکاری تعلیمی اداروں میں پڑھے گی اور اس کا اور اس کے اہل خانہ کا علاج سرکاری ہسپتالوں میں ہوگا۔ تب انقلاب نعرہ نہیں رہے گا، وہ تعلیم اور صحت کے شعبوں میں عملی صورت پر نظر بھی آئے گا۔ منتخب لیڈر کو سب سے زیادہ توجہ ٹیکس کے نظام پر دینی چاہیے کہ اس کے پاس پیسے ہوں گے تو لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوسکیں گے۔ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے منصوبے بنائے جائیں، غریب اور امیر کے مابین فرق کم کرنے کی پلاننگ ہو۔ ایسے اقدامات ہوں جن کا فائدہ متوسط اور نچلی سطح کے لوگوں کو پہنچے۔

صاحبو! اب تک جو لکھا گیا ہے، اس پر نظر ڈالیں اور یہ سوچیں کہ ان تمام کاموں کے کرنے میں کون سی اسٹیبلشمنٹ یا نادیدہ قوتیں رکاوٹ بنی ہیں؟ کسی نے میاں نواز شریف یا آصف زرداری صاحب کو روکا تھا کہ وہ ملک میں صحت اور تعلیم کی سہولتیں بہتر نہ بنائیں؟ کسی نے انہیں

یہ کہا کہ پولیس کے اچھے افسر نہ لگاؤ اور غلطی سے اے ڈی خواجہ جیسا دیانت دار آئی جی لگ جائے تو اسے ہٹانے کے درپے ہو جاؤ۔ اسٹریٹ کرائم ختم کرنے سے کس نے روکا؟ عام آدمی کے لیے صاف پانی کی فراہمی میں کون رکاوٹ بنا؟ کس نے کہا کہ ملک میں روزگار کے منصوبے نہ بناؤ اور دو ڈھائی سو ارب روپے نئی صنعتیں قائم کرنے کے بجائے ٹرین کے منصوبوں پر لگا دو۔ کس نے نواز شریف صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اسحاق ڈار کو وزیر خزانہ لگاؤ، جسے زراعت کا ککھ پتہ نہیں، جو کاشت کاروں کا بیڑا غرق کر دے اور ملکی تاریخ میں پہلی بار ہزاروں، لاکھوں کسان زمینیں کاشت کرنے کے بجائے خالی چھوڑ دیں۔ کس نے انہیں اس پر مجبور کیا؟ ملک میں تربیت یافتہ لیبر کی شدید ضرورت ہے، سی پیک کی کامیابی کی صورت میں اگلے چند برسوں کے دوران ہمیں لاکھوں ایسے ٹرینڈ مزدور، مکینک وغیرہ چاہئیں۔ اس طرف کیوں کچھ نہیں کیا جا رہا؟ کیا اس کے لیے اسٹیبلشمنٹ رکاوٹ بنی ہے؟ یہ سب کام ایسے ہیں جن کے کرنے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مسائل صرف نیشنل سکیورٹی ایشوز میں درپیش آتے ہیں۔ جو کام سول حکومتیں آسانی سے کر سکتی ہیں، وہ تو کریں۔ ایسا کرنے کے بجائے ہر قومی ادارے پر اپنی مرضی کا کمزور شخص لگا کر اربوں، کھربوں لوٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کئی برسوں تک حکومت میں رہنے کے باوجود عوام کے لیے کچھ بھی نہ کر پائے تو تمام الزام اسٹیبلشمنٹ پر دھر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ سیاستدانوں کی ناکامی ان کی اپنی ناکامی ہے، اسٹیبلشمنٹ کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اپنی غلطیاں انہیں ماننی چاہئیں۔

ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسٹیبلشمنٹ سے غلطیاں نہیں ہوتیں۔ نیشنل سکیورٹی ایشوز پر بھی انہوں نے بہت سے بلنڈر کیے۔ مگر ان پر الگ سے بات ہو گی۔

------------------

ڈاکٹر شہزاد سلیم/محمد محمود مرزا

# کامیاب والدین

موجودہ دور میں والدین اور اولاد کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔اور اس فاصلے میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔اگر غور کیا جائے تو چند مستثنیات کو چھوڑ کر والدین ہی اس کشمکش کے اصل ذمہ دار ہیں۔وہ نہ اپنے بچوں پر ان کے بچپن میں کوئی خاص توجہ دیتے ہیں اور نہ ان کی اخلاقی تربیت اور نشوونما کو اپنا اصل ہدف بناتے ہیں۔

جب تک والدین کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوتا ہے تب تک بچے کچھ بری عادات پوری طرح اختیار کر چکے ہوتے ہیں جن سے جان چھڑانا اکثر ناممکن ہو جاتا ہے۔ان میں سے ایک انتہائی بری عادت منشیات اور شراب نوشی کی لت ہے۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ والدین کو ہوش تب آتا ہے جب پانی سر سے اوپر ہو جاتا ہے اور بچے آخری درجے میں اس لت کا شکار ہو چکے ہوتے ہیں۔اور پھر وہ ان بری عادات کو روکنے کے لیے ہر ممکن اقدام اٹھاتے ہیں جن میں سے بدترین بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا، دھمکانا اور اس لت کے بھیانک نتائج سے ڈرانا ہے۔

زیادہ تر یہی دیکھا گیا ہے کہ اولاد کے اس موڑ پر پہنچنے کے بعد اس نوعیت کا کوئی اصلاحی اقدام کارگر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اب بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔تاہم والدین کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ بری عادات کسی بھی بچے میں پیدا ہو سکتی ہیں، یہاں تک کہ ان بچوں میں بھی جن کی پرورش بہت اچھے انداز میں ہوتی ہے۔ایسے بچوں کے ساتھ پیش آنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ والدین ان پر اپنا اعتماد بحال کریں اور اس طرح کی بری عادات سے نجات دلانے میں ان کی بھرپور مدد کریں۔والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ اس حد تک سخت اور تلخ نہیں ہونا چاہیے کہ بچے اپنے ہی والدین سے کترانے لگ جائیں۔وہ کچھ غلط کام ہونے پر والدین کے سامنے بیان کرنے سے خوف محسوس کریں اور بالآخر اپنی برائیوں اور غلطیوں کو چھپانے پر مجبور ہو جائیں۔

یاد رکھیے! کامیاب ترین والدین وہ ہیں جن کے بچے اپنی ہر غلطی اور برائی کا تذکرہ کسی اور کے سامنے کرنے کے بجائے سب سے پہلے اپنے والدین سے کرتے ہیں۔

عظمیٰ عنبرین

# مثبت سوچیے، خوش رہیے

ہر انسان چاہتا ہے کہ مجھے خوشیوں بھری، پر سکون زندگی مل جائے، مشکلات حل ہو جائیں۔ کسی کی بھی زندگی کے صفحات کھول کر دیکھ لیں، وہ پریشانیوں میں گھرا ہوا نظر آئے گا۔ لوگوں کی زندگیوں میں ایک سے بڑھ کر ایک پریشانیوں کی داستانیں بھری ہوتی ہیں۔ شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جس کی زندگی میں صرف خوشیاں ہوں اور وہ کبھی پریشانی و تکلیف کا شکار نہ ہوا ہو، کیونکہ دکھ سکھ ہوں یا خوشی و غمی، یہ انسان کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں اور اس کی فطرت میں شامل ہوتے ہیں۔ کسی کامیاب ترین یا ''بڑے'' کی زندگی میں جھانک کر دیکھ لیں، وہ بھی اس چیز سے محفوظ نظر نہیں آئیں گے۔ البتہ اس صورتحال میں کرنے کا جو کام ہوتا ہے وہ یہ ہونا چاہیے کہ کسی قسم کی منفی کیفیات مستقل ہم پر طاری نہ ہو سکیں۔ ہمیں خود کو اس بات کے لیے تیار رکھنا چاہیے کہ تمام زندگی، کسی بھی لمحہ، کوئی بھی کیفیت ہمارا استقبال کر سکتی ہے۔ یہ کیفیات زندگی کی علامت ہیں، اگر مسائل نہ ہوتے تو آسودگی کی پہچان کیسے ہوتی۔

**ان کا حل:**

ماضی کو ہم بدل نہیں سکتے اور مستقبل کے حالات ہم انسانوں کے قبضۂ قدرت میں نہیں ہوتے۔ اس حقیقت کو اگر سمجھ لیا جائے تو نہ ماضی کے تجربات مایوس کریں گے اور نہ ہی مستقبل کی فکر پریشان کرے گی۔ نامناسب حالات درست کرنے کا یقینی فارمولا اللہ پر کامل بھروسہ ہے، اس سے تمام تلخیاں اور تفکرات دور ہو سکتے ہیں اور دل بھی مطمئن رہتا ہے۔ نیز چند اصولوں پر عمل کر کے ان کے مثبت اثرات آپ خود محسوس کریں گے:

**1) غم کو قریب نہ آنے دیں:** جب ہم غم و فکر میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں تو مرض کو خود ہی دعوت

دے رہے ہوتے ہیں۔غم اور ذہنی دباؤ کا جسمانی صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔اس کیفیت میں افاقہ کے لیے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ کر، آنکھیں بند کر کے خود کو پر سکون حالت میں تصور کریں، آہستہ آہستہ اور گہری سانس لیں۔رنج وفکر کے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیں۔

**2) دوسروں کی غلطیوں کو معاف کریں:** ہماری بہت ساری معاشرتی خرابیوں کا باعث وہ کینہ اور بدگمانی ہوتی ہے جس میں ہم مبتلا ہو جاتے ہیں، اس کے جتنے برے اثرات ہمارے اپنے قلب ودماغ پر پڑتے ہیں دیگر افراد پر نہیں پڑتے۔

درگزر اور محبت ایک ایسی طاقت ہے جس کے مثبت اثرات پوری کائنات میں محسوس ہوتے ہیں۔اس لیے تکلیف دہ یادداشتوں کو دل ودماغ پر سوار رکھنے کے بجائے دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے کی عادت ڈالیے۔اس سے آپ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے۔

**3) منفی رویوں کو نظر انداز کرنا سیکھیں:** اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں دوسروں کے تلخ رویے اور باتیں تکلیف پہنچاتی ہیں۔مختصر سی زندگی کو رنجیدہ ہو کر ضائع نہیں کرنا چاہیے۔لوگوں کی تکلیف دہ باتوں پر قطعی کوئی توجہ نہ دی جائے اور اس کے جواب میں خاموشی اختیار کی جائے۔اس طرز عمل سے آپ بہت سے لڑائی جھگڑوں اور ان کے مضر اثرات سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

**4) اپنی ایک ڈائری بنائیں:** اپنی ایک ڈائری بنانے سے ہم منظّم انداز میں تمام کاموں کو ان کی اہمیت کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔آج کل ہر انسان بے شمار مسائل میں پھنسا ہوا ہے۔ایسے کاموں کا ایک ہجوم ذہن میں ہوتا ہے جنہیں مکمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ایسے میں کچھ باتوں کا ذہن سے نکل جانا کچھ ناممکن نہیں۔بعض اوقات یہ صورتحال تلخیوں کا باعث بھی بن جاتی ہے خصوصاً جب کسی سے کوئی وعدہ کر رکھا ہو اور دیگر کاموں میں مصروف ہو کر وعدہ پورا کرنا بھول جائیں اور لاپرواہی کا ٹھپہ لگ جائے۔کبھی بچوں کی فیس یا اسکول کے دیگر معاملات نمٹانے ہوں

یا بلوں کی ادائیگی کرنی ہو یا پھر کسی سے کوئی ضروری ملاقات طے کر رکھی ہو، ہر کام کو اس کی اہمیت کے مطابق سرانجام دینے کے لیے ڈائری بنا لینا بہت مفید ہے۔

**5) زندگی کا مقصد متعین کریں:** اگر آپ صرف کھانے پینے، آرام کرنے اور پرتعیش زندگی گزارنے کو اپنا نصب العین بنائیں گے تو خوشحال اور پرسکون زندگی کے حصول میں ناکام ہو جائیں گے۔ اپنے لیے اپنی ذات سے کہیں بلند مقاصد متعین کیجیے، اپنی خدمات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایئے، یقین کیجیے خلوص نیت کے ساتھ دوسروں کے کام آنے سے جو قلبی سکون حاصل ہوتا ہے اس کا کوئی مول نہیں اور وہ آپ کو اللہ سے بھی جوڑ دیتا ہے۔ کسی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں تو قرآن کریم کی اس آیت پر کاربند ہو جائیں جس میں کہا گیا ہے "ہم تو تمہیں صرف اللہ کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے"۔ بس یہ سمجھ لیں کہ یہ معاملہ آپ کا اللہ کے ساتھ ہے، آپ دیکھیں گے کہ یہ چیز آپ کی زندگی کا حصہ بنتی چلی جائے گی۔ اپنی زندگی کا حساب اس بات سے نہیں کریں کہ اب تک کیا کیا ہے بلکہ اس چیز سے کریں کہ آپ کیا مفید کام کر سکتے تھے جو آپ نے ابھی تک نہیں کیا۔

**6) مثبت سوچیے اور خوش رہیے:** ہمارا ذہن اتنی طاقت رکھتا ہے کہ مثبت و خوشگوار خیالات کے ذریعے نفسیاتی امراض پر قابو پا کر خوش رہا جا سکتا ہے۔

اپنے ذہن پر توجہ دیں، منفی جذبات سے بچنے کے لیے مثبت چیزوں کے بارے میں سوچیں، سب کے خیر خواہ بنیں اور ہمیشہ اللہ سے اچھی امید رکھیں، وہ بندے کے گمان کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ فرماتے ہیں۔

-----------------

فرح رضوان

# ایک اچھی ساس کے کچھ اجزائے ترکیبی

## حصہ (ج)

دیکھیں! اب بات پہلے جیسی نہیں رہی، کل تک آپ جس سلطنت کی تنہا مالک تھیں، اب اس میں مداخلت ہو چکی ہے اور دوسرے بیٹوں کی شادی کے ساتھ ہی اس اقتدار میں دوسروں کی حصہ داری بڑھتی چلی جائے گی۔ سوچیے، کیا آپ میں حب جاہ یا لیڈر شپ کی تمنا ہے یا کسی احسان کے بدلے شکریہ سننے کی اطلب......؟ یقیناً ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اب آپ کو کھلے دل سے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دراصل اب آپ کی اقدار اور کردار بہو کو منتقل ہوگا گرچہ اس سے آپ کی اہمیت میں کمی بالکل نہ ہوگی۔

جس طرح موسم بدلنے پر شاخوں سے زرد پتے ٹوٹ کر بظاہر نئے سرسبز وشاداب پتوں کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں لیکن درحقیقت وہ کھاد میں بدل کر درخت کی زرخیزی میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ اسی طرح اب آپ کی زندگی کے تجربات سے دوسروں کی زندگی سہل بنانے کا وقت ہے۔ لیکن آپ کو نہایت حکمت سے کام لے کر اس طرح باتوں باتوں میں سکھانا ہوگا کہ سامنے والے کو احساس کمتری نہ ہو، نہ ہی وہ اسے ڈکٹیشن سمجھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ نے کبھی کسی پر احسان نہیں جتانا، خواہ وہ اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ نہایت برا عمل ہے جو خود آپ کے اپنے حق میں نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ہمارے ہاں کی خواتین عموماً بہو کے آتے ہی آرام کرنے اور اس سے خدمت کروانے کو ترجیح دینے لگتی ہیں، نتیجتاً بہت جلد خود کو بوڑھا محسوس کرتی ہیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تھکن، جھلاہٹ، مایوسی و دیگر نفسیاتی واخلاقی بیماریوں کا شکار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اگر بہو

سے خدمت کروانے کے بجائے آپ اپنے کارآمد ہاتھ پاؤں ، دیگر اعضا اور حواس کا استعمال کریں اور اس پر ہر دم رب کا شکر ادا کریں تو آپ کو کبھی اس قسم کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ کبھی یہ مت سوچیں کہ کوئی دوسرا آپ کی جگہ لے رہا ہے یا آپ سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہر تالے کی چابی ہاتھ میں رکھنے کا اصل گُر یہی ماسٹر کی ہے کہ بدگمانی سے ہر صورت بچا جائے۔

یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر ہم ہی ایسا کیوں کریں؟ سب اچھا رکھنے کی ذمہ داری صرف ہم پر ہی کیوں عائد ہو؟ تو بات دراصل یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی عمل پر ہمارا کوئی بھی ردعمل اگر مسلسل برا ہے یا ہم صرف اچھا عمل کرنا ہی روک دیتے ہیں تو اس سے کسی دوسرے سے زیادہ ہم خود کو نقصان پہنچا رہے ہوتے ہیں۔ قبر کی تنہائی میں یہی برے اعمال انتہائی بدشکل آدمی کی صورت میں سامنے آئیں گے، جبکہ اچھے اعمال خوبصورت شخص کی صورت خوشخبری کی نوید سنائیں گے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں اکثر مقامات پر جاری رہنے والی نہروں کا ذکر آیا ہے، تو یہ نہریں صرف ان لوگوں کا مقدر ہوں گی جو صالحین ہوں گے، جنہوں نے تا حیات خوف و رجاً کا دامن تھامے رکھا، اپنی اصلاح کا عمل جاری رکھا، اخلاص کے ساتھ نیک عمل کرتے رہے، صبر جمیل پر قائم رہے اور اپنے رب کی رضا کی خاطر برائی کا جواب بھلائی سے دیتے رہے۔

(جاری ہے)

------------------

انسان کی جہالت اصل مسئلہ نہیں ہوتی

اصل مسئلہ جہالت کے باوجود

اپنی بات پر اعتماد ہوتا ہے

نمرہ رفیق

# عذاب الٰہی سے بے خوفی کا رویہ

ہمیں لگتا ہے کہ اللہ کا عذاب بہت ہلکی چیز ہے جسے ہم بہت آسانی سے برداشت کر لیں گے، جبکہ یہ ہماری بہت بڑی بھول ہے۔ روز محشر اللہ جس شخص کو بھی اپنے عذاب کا مزہ چکھائے گا، اگر اس کی ایک ہلکی سی جھلک اس شخص کو اسی دنیا میں دکھا دی جائے تو وہ کبھی گناہ کے قریب نہ جائے گا۔ کاش! کاش کہ ہم اس عذاب کی شدت کا اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔ یہ جاننے کی کوشش کریں کہ عذاب چھوٹا ہو یا بڑا، ہمارے یہ نازک اعضا اس کی شدت اور ہولنا کی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

جب تک انسان کے دل میں اس کے رب کا خوف پیدا نہیں ہو گا تب تک وہ گناہوں سے دور نہیں جا سکتا۔ آج اگر امت مسلمہ گناہوں کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے تو اس کی واحد وجہ اپنے رب سے لاتعلقی اور اس کے عذاب سے بے خوفی ہے۔ کیونکہ جس انسان کے دل میں عذاب الٰہی کا خوف ہو، اس کے لیے گناہوں سے دور رہنا آسان ہو جاتا ہے۔

لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہم اللہ کا خوف اپنے دل میں کیسے پیدا کریں جبکہ ہم اپنے اردگرد جن لوگوں کو دیکھتے ہیں، جن سے ملتے ہیں یا جن کے ساتھ ہمارے تعلقات قائم ہیں وہ آخرت کی فکر سے ناآشنا ہیں۔ جب انسان کا اپنا ذہن خالی ہو یا اس میں کسی ذریعے سے مثبت سوچ پیدا نہ ہو رہی ہو، تب اس کے ماحول کے منفی اثرات بہت جلد اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ خواہ کسی بھی قسم کے لوگوں کے درمیان کیوں نہ رہ رہے ہوں، اگر آپ کا تعلق اللہ اور اس کی کتاب کے ساتھ مضبوط ہے تو پھر آپ پر ماحول کے منفی اثرات اس طرح اثر انداز نہیں ہوتے جس طرح عام طور پر ہوتے ہیں۔

اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جس ماحول میں اپنی زندگی گزارتا ہے اس پر اس کے بہت گہرے اثرات پڑتے ہیں، لیکن ایک بات جو یہاں کہنا چاہوں گی کہ اگر آپ کے دل میں ہدایت کی طلب ہو اور آپ اس کے لیے کوشش بھی کر رہے ہوں تو ایسا ہو نہیں سکتا کہ اللہ آپ کی کوششوں کو رائیگاں جانے دے۔

ہمیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ کے غضب سے جو چیز ہمیں محفوظ رکھ سکتی ہے وہ اس کا خوف، اس کی محبت اور اس کی کتاب سے جڑا تعلق ہے۔ اگر ہمارے دل میں اس کا خوف نہیں، نہ اس کی محبت ہے اور نہ ہم اس کی کتاب سے جڑے ہیں تو ہمیں اپنے لیے سنجیدگی کے ساتھ فکرمند ہونا چاہیے کیونکہ ہم اس کے غضب کو ٹھنڈا کرنے والی ہر چیز سے دور ہیں۔

عذاب الٰہی سے بے خوفی کا رویہ ہمارے حق میں کتنا نقصان دہ ثابت ہوگا، ابھی سے اس کا اندازہ لگانا کچھ اتنا مشکل نہیں۔ جب کبھی بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے آپ کا دل سہم جائے تو آپ غفلت کی نیند سے جاگ جائیں......زلزلے کی ہولنا کی، سیلابی ریلے یا سمندری طوفان کی سرکشی، گرمی کی شدت، قحط غرض کوئی بھی قدرتی آفت ہو، یہ سب اللہ کے عذاب کی یاددہانی ہے، یہ احساس دلانے کو، کہ آج وقت ہے، مہلت ہے، سنبھل جائیں۔ اپنی پیدائش کو بیکار نہ جانیں۔ خدا سے بے خوف مت ہوں۔

---

روزہ جنت کا دروازہ ہے مگر
یہ دروازہ صرف وہی شخص کھول سکتا ہے جو
روزے کی مشقت کو تقویٰ کی کنجی میں بدل سکے

ابو یحییٰ
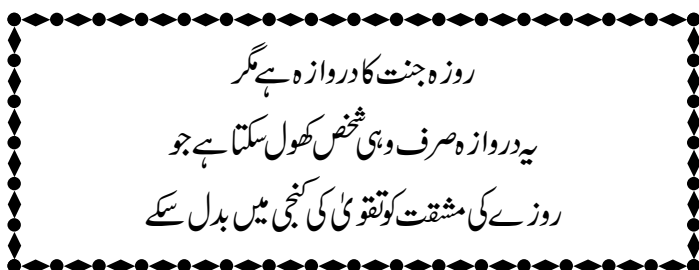
# مضامین قرآن (43)

## دعوت کے رد و قبول کے نتائج: قیامت: موجودہ دنیا کا خاتمہ

### قیامت کے وقت کی دنیا

قرآن مجید روزِ قیامت کو تین حوالوں سے زیر بحث لاتا ہے۔ایک اس دن کی علامات، دوسرا موجودہ دنیا کا خاتمہ اوراس موقع پر رونما ہونے والی مکمل تباہی اور تیسرا آخرت کی دنیا کے آغاز پر تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے حساب کتاب کے لیے ان کا جمع کیا جانا۔علامات قیامت پر پیچھے بات ہوچکی ہے۔اس میں ہم نے یہ واضح کیا تھا کہ قرآن مجید نے قیامت کی ایک ہی علامت بیان کی ہے وہ ہے یاجوج ماجوج کی نسلوں کا دنیا پر غلبہ اور تاخت۔اس حوالے سے ایک اور اہم بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

قرآن مجید کے مطابق وہ دنیا جس پر قیامت آئے گی،اس دنیا میں حضرت ابراہیم کے نام لیوا مذہبی گروہ موجود ہوں گے۔ان میں سے یہود و نصاریٰ کا تو قرآن مجید نام لے کر وضاحت کرتا ہے کہ قیامت تک وہ موجود رہیں گے۔رفع مسیح کے وقت اللہ تعالیٰ نے اپنا جو منصوبہ حضرت عیسیٰ کو بتایا تھا اس میں یہ بات بالصراحت بیان کی گئی تھی کہ حضرت عیسیٰ کے پیروکار جن میں مسیحی اصلاً اور مسلمان تبعاً شامل ہیں،ان کے منکرین یعنی یہود پر قیامت تک کے لیے غالب رہیں گے،(آل عمران 55:3)۔یہ آیت نص قطعی ہے کہ حضرت ابراہیم کے نام لیوا قیامت کے دن تک باقی رہیں گے۔قرآن مجید نے دیگر کئی مقامات پر اس حقیقت کو یہود و نصاریٰ کا نام لے کر اس طرح بیان کیا ہے کہ ان میں قیامت کے دن تک کے لیے بغض و عداوت ڈال دیا گیا

ہے۔ چنانچہ کسی کو اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ قیامت کسی قسم کے بدلے ہوئے حالات میں نمودار ہوگی۔ ظہورِ یاجوج ماجوج کے بعد قیامت کسی بھی وقت اچانک آ سکتی ہے۔

**دنیا کا خاتمہ**

قیامت موجودہ دنیا کے خاتمے کا نام ہے۔ قرآن مجید نے قیامت کا آغاز جس واقعے کو قرار دیا ہے وہ صور کا پھونکا جانا ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلی دفعہ پھونکنے پر موجودہ دنیا کے خاتمے کا آغاز ہو جائے گا اور دوسری دفعہ پھونکے جانے پر آخرت کی دنیا کا آغاز ہوگا۔ یہ صور امور متشابہات کی نوعیت کی چیز ہے۔ قرآن مجید میں متشابہات کا طریقہ ان حقائق کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جن کی حقیقت کو اپنے محدود علم کی بنا پر اس وقت ہم نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن کسی ملتی جلتی چیز سے اس حقیقت کا وہ تصور ہم کو دے دیا جاتا ہے جس کا دیا جانا مقصود ہوتا ہے اور جس تصور کا سمجھنا انسانوں کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ صور زمانہ قدیم میں جانوروں کے سینگ سے بنایا جانے والا ایک باجہ ہوتا تھا۔ اس کے ایک طرف سے پھونک ماری جاتی تھی اور دوسری طرف سے زوردار آواز نکلتی تھی۔ اسے نرسنگھا، بگل، قرنا وغیرہ بھی کہتے ہیں اور اس کا مقصد زمانہ قدیم میں بادشاہ کی آمد کا اعلان کرنا یا اعلان جنگ کرنا ہوتا تھا۔

اس تعبیر سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ قیامت کے آغاز پر کوئی ایسا معاملہ ہوگا جو ایک اعلان عام بن کر ہر خاص و عام کو مطلع کر دے گا کہ دنیا کی مہلت عمل ختم ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تمام لوگ جو اس سے قبل اطمینان سے گھوم پھر رہے ہوں گے، ہول کھا کر گھبرا اٹھیں گے۔ یہ صور عالم اور اہل عالم کی مکمل تباہی کا اعلان عام ہوگا۔

**مکمل تباہی کا دن**

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قیامت کا دن اسی تباہی کے دن کے لیے بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں معاملہ یوں نہیں ہے۔ قرآن مجید قیامت کے دن کی تعبیر اصلاً اس وقت کے لیے استعمال کرتا ہے جب دوسرے صور کے بعد تمام مردوں کو زندہ کر دیا جائے گا۔ پہلے صور کے بعد پیش آنے والے واقعات کے لیے قرآن مجید نے دیگر تعبیرات اختیار کی ہیں جیسے ''الساعۃ'' یعنی وعدے کی گھڑی، ''القارعۃ'' یعنی کھڑکھڑانے والی، ''الواقعۃ'' یعنی ہو کر رہنے والی، ''الحاقۃ'' یعنی ہونی شدنی وغیرہ۔ یہ تمام تعبیرات اس وقت کا بیان کرتی ہیں جب اللہ کا عذاب فیصلہ کن طور پر نازل ہو کر دنیا کو ختم کر دے گا۔ تاہم قیامت کا دن عمومی طور پر آخرت کے تمام مراحل کے لیے بول دیا جاتا ہے۔

صور پھونکے جانے کے ساتھ ہی دنیا کی تباہی کا آغاز ہو جائے گا۔ لوگ مارے ہول کے گر کر بے ہوش ہونے لگیں گے۔ وحشی جانور دشمنی بھول کر اکٹھے ہو جائیں گے۔ زلزلے پر زلزے آنے شروع ہوں گے اور زمین ڈولتی کشتی کی طرح جب ہچکولے لے گی تو انسان کے قدم بھی کسی مدہوش شخص کی طرح ڈگمگانے لگیں گے۔ خوف و دہشت کا عالم ہوگا۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح فضا میں بلند ہو جائیں گے اور آخر کار ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ سمندر ابل کر اپنی حدوں سے باہر نکل جائیں گے۔ سورج، چاند، تارے اور اجرام فلکی سب کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ غرض یہ دن ایک مکمل اور ہمہ گیر تباہی کا دن ہوگا جس کی ہولناکی سے زمین و آسمان سب تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

## قرآنی بیانات

''اے لوگو! اپنے خداوند سے ڈرو۔ بے شک قیامت (الساعہ) کی ہلچل بڑی ہی ہولناک چیز ہے۔ جس دن تم اسے دیکھو گے اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول

جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب ہے ہی بڑی ہولناک چیز!'' (الحج22: 2-1)

''یادرکھو، جب کہ واقع ہو پڑے گی واقع ہونے والی (الواقعہ)۔ اس کے واقعہ ہونے میں کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں۔ وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔ جب کہ زمین بالکل جھنجھوڑ دی جائے گی اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہوکر منتشر غبار بن جائیں گے۔''

(الواقعہ56: 6-1)

''شُد نی (الحاقہ)! کیا ہے شُد نی (الحاقہ)! کیا جانو کہ کیا ہے شُد نی (الحاقہ)! ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی (القارعہ) کو جھٹلایا۔'' (الحاقہ69: 4-1)

''پس یاد رکھو جب کہ صُور میں ایک ہی بار پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا تو اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی۔ اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن وہ نہایت پھُس پھُسا ہوگا۔'' (الحاقہ69: 16-13)

''کھٹکھٹانے والی (القارعہ)! کیا ہے کھٹکھٹانے والی (القارعہ)! اور تم کیا سمجھے کہ کیا ہے کھٹکھٹانے والی (القارعہ)! اس دن لوگ منتشر پتنگوں کے مانند ہوں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے۔'' (القارعہ101: 5-1)

''اور جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی عہد لیا تو جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے تو ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں عنقریب اللہ اس سے ان کو آگاہ کرے گا۔'' (المائدہ5: 14)

''اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ ان کے بندھ جائیں اور ان کی اس بات کے سبب سے ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور ان کے کفر کو وہ چیز بڑھا رہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتاری گئی ہے اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لیے ڈال دیا ہے۔ جب جب یہ لڑائی کی کوئی آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو

بجھا دے گا۔ یہ زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘ (المائدہ5: 64)

’’جب کہ اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ میں تمہیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمہارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف تم سب کا پلٹنا ہوگا اور میں تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔‘‘ (آل عمران3: 55)

’’جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ پہاڑ چلا دیے جائیں گے اور دس ماہہ گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر ابل پڑیں گے۔‘‘ (التکویر81: 6-1)

’’اور صور پھونکا جائے تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کے گر پڑیں گے مگر جن کو اللہ چاہے۔ پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو دفعتہً وہ کھڑے ہو کر تاکنے لگیں گے۔‘‘ (الزمر39: 68)

’’جب کہ آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لیے یہی زیبا ہے۔ اور جب کہ زمین تان دی جائے گی اور وہ اپنے اندر کی چیزیں باہر ڈال کر فارغ ہو جائے گی اور وہ اپنے خداوند کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اس کو یہی چاہیے۔‘‘

(الانشقاق84: 5-1)

’’اور اس دن کا خیال کرو جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب گھبرا اٹھیں گے۔ صرف وہی اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ چاہے گا اور سب اس کے آگے سرفگندہ ہو کر حاضر ہوں گے۔‘‘ (النمل27: 87)

[جاری ہے]

---

مبشر نذیر

# ترکی کا سفرنامہ (47)

علوم دینیہ کا ایک نہایت ہی اہم حصہ بالعموم مدارس میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور اسلام کی تاریخ۔ عام طور پر مدارس کے اعلیٰ عہدے دار یہ کہتے ہیں کہ ہم طالب علم میں ایسی استعداد پیدا کر دیتے ہیں جس کی بدولت وہ ان علوم کا خود مطالعہ کر سکتا ہے۔ اگر اس دعویٰ کو درست بھی مان لیا جائے، اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ طالب علم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ان علوم کی باقاعدہ تعلیم ناگزیر ہے۔

طالب علموں کی اخلاقی تعلیم و تربیت اور کردار سازی کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جب یہ حضرات منبر و محراب کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں تو مسجدیں اکھاڑوں میں بدل جاتی ہیں۔ ان طالب علموں کو اختلاف رائے کے آداب سے ناواقف رکھا جاتا ہے۔ مخالف فرقوں کی نفرت ان کی رگوں میں اتار دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اختلاف رائے کی صورت میں انہیں گالی گلوچ، الزام تراشی، پتھر، جوتا، اور بندوق کی گولی، جو کچھ دستیاب ہو، استعمال کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔

دین کے ایک طالب علم کے لئے دیگر مذاہب اور مکاتب فکر کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس پر عموماً توجہ نہیں دی جاتی اور اگر اس ضمن میں کچھ پڑھایا بھی جاتا ہے تو اس کا مقصد صرف اور صرف ان کی تردید کرنا ہوتا ہے۔ بے تعصب تجزیاتی مطالعہ کے طریق کار سے عموماً اہل مدرسہ ناواقف رہ جاتے ہیں۔

مدارس کے طریق تعلیم کا ایک بہت بڑا مسئلہ ذہنی، فکری اور نفسیاتی غلامی ہے۔ مدارس میں

برین واشنگ کے ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں جن کے نتیجے میں طالب علم کی شخصیت کو بری طرح مسخ کر دیا جاتا ہے۔ وہ اب اپنے ہی مسلک کی بعض شخصیات کے ذہنی غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان شخصیات کو مقدس بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی کسی بات سے اختلاف رائے کو بہت بڑا جرم قرار دے دیا جاتا ہے۔ جو قارئین اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ اس کی تفصیل میری کتاب ''مسلم دنیا میں ذہنی، فکری اور نفسیاتی غلامی'' میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ وہ مسائل ہیں جن کا کسی بھی مدرسے سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص شب و روز مشاہدہ کر سکتا ہے۔ اللہ تعالی کا شکر ہے کہ بہت سے مدارس کے ارباب اختیار نے ان مسائل کا ادراک کر لیا ہے اور اس ضمن میں وہ اصلاح کی کوششوں میں مشغول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو کامیابی عطا کرے اور دیگر مدارس کے ارباب اختیار کو بھی ان مسائل کا ادراک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مدرسے سے فارغ ہو کر ہم اس کے ساتھ ہی موجود قلعے کی طرف بڑھے۔ اس وقت یہ قلعہ بند تھا جس کی وجہ سے باہر کی دیوار ہی نظر آ سکی۔ یہ ایک عظیم پرشکوہ قلعہ تھا۔ قلعے کی دیواریں کافی چوڑی تھیں۔ ارض روم کی سرحدی حیثیت کی وجہ سے یہاں ہر دور میں فوج رہا کرتی تھی۔ آثار قدیمہ میں بالعموم قلعے، محل اور عبادت گاہیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ ان عمارتوں کی تعمیر غیر معمولی حد تک مضبوط ہوتی ہے۔

### ارزنجان

اب ہم ارض روم سے باہر جانے والی سڑک پر جا رہے تھے۔ یہ سڑک نئی نئی بنی تھی چنانچہ ڈرائیونگ میں لطف آنے لگا مگر تھوڑی دور جا کر یہ لطف ختم ہو گیا۔ آگے پرانی سڑک تھی جس میں جگہ جگہ کھدائی کر کے ٹریفک کو ادھر ادھر کیا جا رہا تھا۔ پورے ترکی کے سفر میں اندازہ ہوا کہ بحیثیت مجموعی ترکی کی سڑکوں کے مقابلے میں پاکستان کی سڑکیں کافی بہتر ہیں۔

سڑک کے بورڈز پر ارزنجان اور ترابزن دونوں کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ''اشکیل'' پہنچے۔ یہاں سے ترابزن اور ارزنجان جانے والے راستے علیحدہ ہو رہے تھے۔ کچھ سفر طے کر کے ہم ''ترجان گولو'' جا پہنچے۔ یہ نیلے پانی کی ایک خوبصورت جھیل تھی جو خشک پہاڑوں کے درمیان اپنی بہار دکھا رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں ہم ارزنجان جا پہنچے۔ شہر کے اندر جانے والی سڑک پر ''شہر مرکزی'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ بورڈ ہمیں ہر شہر میں نظر آیا۔ ترکی کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر شہر کے بورڈ پر اس کی آبادی بھی درج ہوتی ہے۔ ارزنجان بھی ایک چھوٹا سا شہر تھا مگر صوبائی دارالحکومت تھا۔ چونکہ ترکی کے صوبے ہمارے ضلعوں کے برابر ہیں اس وجہ سے ان کے دارالحکومت بھی اتنے ہی ہیں۔ یہاں کی خوبی یہ تھی کہ ہر گھر پر سولر پینل نظر آ رہا تھا۔ تیل کی زیادہ قیمتوں کے باعث دنیا بھر کی قومیں اب توانائی کے متبادل ذرائع کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تیل اور گیس کی صورت میں توانائی کے اعلیٰ ترین ذخائر دیے ہوئے تھے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان انہیں امت مسلمہ میں سے غربت اور جہالت کے خاتمے کے لئے استعمال کرتے مگر انہوں نے اسے اپنی عیاشی کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کا نتیجہ اب یہ نکل رہا ہے کہ دنیا توانائی کے متبادل ذرائع کو بہتر بنا رہی ہے۔ جیسے ہی اس ٹیکنالوجی نے ترقی کر لی، تیل کی عالمی ڈیمانڈ اور قیمتیں زمین پر آ جائیں گی۔

ہم جس راستے پر جا رہے تھے، ابن بطوطہ بھی اسی راستے سے گزرے تھے مگر ان کا رخ ہماری مخالف سمت میں تھا۔ لکھتے ہیں:

ہم ارزنجان پہنچے۔ یہ بھی عراق کے بادشاہ کے تحت شہروں میں سے ایک بڑا گنجان آباد شہر ہے۔ اس کے اکثر باشندے آرمینی ہیں۔ یہاں کے مسلمان ترکی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ اس کے بازاروں کی ترتیب عمدہ تھی۔ یہاں بہت ہی خوبصورت کپڑے بنائے جاتے تھے۔

یہاں تانبے کی کانیں تھیں جس سے برتن اور اوزار بنائے جاتے تھے۔

**سیواس**

اب تک سڑک کے بورڈز میں سب سے اوپر ارزنجان بڑے شہر کے طور پر لکھا نظر آ رہا تھا۔ اس سے آگے کے بورڈز پر ''سیواس'' لکھا نظر آنے لگا۔ انقرہ کا ابھی دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ تقریباً 250 کلومیٹر کے بعد ایک پہاڑی سے اترتے ہوئے اچانک پولیس کی ایک گاڑی نظر آئی۔ اس سے تھوڑی دور ایک اور گاڑی کھڑی تھی۔ اس وقت جتنی گاڑیاں بھی چل رہی تھیں، انہوں نے سب ہی کو روک لیا۔ ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے، ''سر! سپیڈ لمٹ۔'' یہ کہہ کر انہوں نے میرا انٹرنیشنل لائسنس طلب کیا۔ کہنے لگے کہ آپ کی اسپیڈ 116 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ ہائی ویز پر پوری دنیا میں 120 کی حد رفتار کا قانون ہے۔ کہنے لگے: ''ترکی میں یہ 100 ہے۔'' مجھے پورے ترکی میں سوائے موٹروے کے ایک بھی بورڈ نظر نہیں آیا جس میں حد رفتار درج کی گئی ہو۔

چالان کروا کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ اب ہم سیواس میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ ایک سرسبز شہر تھا۔ ابن بطوطہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس کے بعد ہم نے سیواس کی طرف سفر کیا۔ یہ بھی عراق کے شہروں میں سے ایک ہے اور اس ملک کے تمام شہروں میں سب سے بڑا ہے۔ یہاں حکام اور امراء کے گھر تھے۔ اس شہر کی عمارتیں خوبصورت تھیں اور سڑکیں کھلی تھیں۔ یہاں کے بازار لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں مدرسے کی طرز کا ایک گھر تھا جو کہ ''دارالسیادت'' کہلاتا تھا۔ یہاں صرف معزز لوگ ہی ٹھہر سکتے تھے۔ اس کے محافظین اس میں رہتے تھے۔ اس میں رہنے والوں کو ان کی مدت قیام تک بستر، کھانا اور چراغ وغیرہ فراہم کیے جاتے تھے۔ جب یہ ختم ہونے لگتے تو مزید فراہم کر دیے جاتے۔

پروین سلطانہ حنا

# غزل

ساتھ اپنے بندوں کے گر خدا نہیں ہوتا
زندگی کو جینے کا حوصلہ نہیں ہوتا

زخمِ آگہی نے تو، پرَ مرے جلا ڈالے
اب اڑان بھرنے کا، حوصلہ نہیں ہوتا

اِک جہان بستا ہے سوچ کے سمندر میں
شہرِ جاں کا موسم تو بے صدا نہیں ہوتا

عشق کے سمندر میں ڈوبنے کا غم کیسا؟
ڈوب جانے والا بھی نارسا نہیں ہوتا

آپ پاس آئیں تو گفتگو بہم ہو گی
فاصلوں کی صورت میں فیصلہ نہیں ہوتا

اُس نے ساتھ چھوڑا تو، ہو گی کوئی مجبوری
کیا کوئی زمانے میں بے وفا نہیں ہوتا؟

تاجدارِ عالم کی پیروی میں جیتی ہوں
اِس لیے تو لوگوں سے کچھ گلہ نہیں ہوتا

وقت کے شہنشاہ تھے، آئے اور گئے آخر
آدمی تو فانی ہے وہ خدا نہیں ہوتا

بادشاہ زادہ ہو، یا فقیر کا بیٹا
عدُل سے تو کوئی بھی ماوَرا نہیں ہوتا

# ابویحییٰ کی کتابیں

## آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

---------------------

## حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

---------------------

## ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

---------------------

## کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

---------------------

## جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

---------------------

## قسم اس وقت کی

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

Monthly
INZAAR
OCT 2017
Vol. 05, No. 10
Regd. No. MC-1380
Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi